صلح امام حسن علیہ السلام

سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ لاہور ۱۴۴

صلح امام حسنؑ

از

محمد شریف

maablib.org

مطبوعہ :- نامی پریس لاہور -

امامیہ مشن پاکستان

کے سلسلۂ اشاعت کی ایک اور انمول پیشکش "صلح امام حسن ؑ" کے موضوع پر آپ کے زیر نظر ہے۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ بنی امیہ نے اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر آل محمد علیہم السلام کے فضائل کو چھپانے کی ہر ممکن کوششیں کیں یہی نہیں بلکہ ان ذوات مقدسہ کے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے کا مکروہ کارنامہ بھی انجام دیا۔ لیکن بھلا حق ان باتوں سے کبھی چھپایا جا سکتا ہے؟ آل محمد علیہم السلام کی سیرت آج بھی اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے باعث رشد و ہدایت رہے گی۔

حضرت امام حسن علیہ السلام خانوادۂ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک مقدس فرد ہیں۔ بنی امیہ نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت حضرت امام حسن علیہ السلام کی ذات اقدس پر بے بنیاد و بے سر و پا اتہامات عائد کیے۔ اس مکروہ پروپیگنڈے کی دھجیاں ان گنت بار بکھیری جا چکی ہیں۔ زیر نظر کتابچہ بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ فاضل مقالہ نگار ملت جعفریہ کے ایک ممتاز قلمکار ہیں انہوں نے آزاد خیال شیعہ کی حیثیت سے صلح امام حسن علیہ السلام کے موضوع پر اختصار کے باوجود نہایت جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ امید ہے کہ آپ حضرات محظوظ ہوں گے۔

افراد ملت اس کتابچہ کی توسیع اشاعت میں حصہ لے کر ثواب دارین حاصل کریں۔

والسلام۔

آنریری جنرل سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان

لاہور

تعداد اشاعت ۱۰ ہزار

جون ۱۹۶۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صلح امام حسنؑ

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم — حافظِ جمعیتِ خیر الامم

تا نشیند آتشِ پیکار و کیں — پشت پا زد بر سرِ تاج و نگیں

غور کرنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صلح امام حسنؑ اور جہادِ امام حسینؑ دراصل ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں اور ایک ہی تصویر کے دو رخ تھے اور ان دونوں میں اتنا گہرا رشتہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ کا تحقیق اور بصیرت کی نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر امام حسنؑ ان حالات میں کہ جن سے وہ دوچار ہوئے معاویہ سے صلح نہ فرماتے تو شہادتِ امام حسینؑ قطعاً بے کار اور بے اثر ہو کر رہ جاتی اور افقِ اسلام آج تک یزیدیت کی انھیں منحوس گھٹاؤں سے گھرا رہتا جن کو دور کرنے کے لیے ذبیحِ کربلا نے سنہ ۶۱ھ میں وفدیناہ بذبح عظیم کی عملی تفسیر کرتے ہوئے وہ عظیم الشان قربانی پیش کی تھی جس کی نظیر تاریخ عالم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

صلح امام حسنؑ کا صحیح تجزیہ کرنے کے لیے آئیے کربلا کے سن وسال سے بیس برس پیچھے چلیں۔ رمضان سن ۴۰ھ میں امیرالمومنینؑ نے شہادت پائی، اور نبیؐ کے سبطِ اکبر امام حسن مجتبیٰؑ مسند آرائے تخت خلافت ہوئے۔ دنیا جانتی ہے کہ حکومتوں کے بدلتے پر تخریبی عناصر اور مخالفینِ سلطنت ہمیشہ اپنی سرگرمیاں تیز کردیا کرتے ہیں۔ چنانچہ امیرِ شام معاویہ نے بھی، جو شروع ہی سے فتنہ پردازی پر تلا ہوا تھا، اس موقع کو غنیمت سمجھا اور تہیہ کرلیا کہ امام عالی مقام سے سلطنت ہتھیانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔ آلِ محمدؐ سے کھلی جنگ میں کامیاب نہ ہو سکنے کا تجربہ بنوامیہ کی پچھلی تاریخ بار بار کر چکی تھی اور صفین میں معاویہ نے خود بھی اس حقیقت کو پوری طرح آزما لیا تھا۔ چنانچہ یہ جانتے ہوئے کہ میدانِ جنگ میں روبرو لڑنے سے آلِ محمدؐ کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا اس نے دفعتہً پینترا بدلا اور مکروفریب اور دھوکہ و دغا سے کام لینا چاہا۔ سب سے پہلی کارروائی جو اس سلسلے میں کی گئی وہ یہ تھی کہ خزانہ شاہی کے منہ کھول دیے گئے اور چاروں طرف جاسوس دوڑا دیے گئے تاکہ وہ کوفہ و عراق کے سرداروں اور جنگجو سپاہیوں کو رشوت کی بڑی بڑی رقموں سے خرید لیں۔ ساتھ ہی ساتھ امام حسنؑ کے لشکر اور سادہ لوح عوام میں ایک عام بددلی اور شورش پھیلانے کی ایک وسیع مہم شروع کر دی گئی۔ ہر طرف جاسوس غلط خبریں اور حوصلہ شکن افواہیں پھیلانے لگے۔ مشہور کر دیا گیا کہ معاویہ نے ایک لاکھ شامیوں کا ایک لشکر جرار فراہم کیا ہے جو چند ہی روز میں ٹڈی دل کی طرح کوفہ

عراق پر یلغار کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیگا۔ مختلف صوبوں کے گورنروں اور نامور قبائل کے سربراہوں کو خطوط لکھے گئے۔ کہ جو شخص امام حسن علیہ السلام کو قتل کرکے ان کا سر معاویہ کی نذر کرے گا اسے بے شمار زر و جواہر کے علاوہ معاویہ اپنی دامادی کا شرف بھی بخشے گا۔ صوبوں کے گورنروں کو یہ بھی باور کرایا گیا کہ امام حسنؑ تو مجھ سے صلح کی بات چیت کر رہے ہیں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ صلح سے پہلے پہلے مجھ سے آملو۔ تمھیں تمھارے عہدوں پر برقرار رکھا جائے گا۔ اور دیکھو صلح کے بعد تو تمھیں بہرطور میری طرف رجوع کرنا ہی ہوگا، اس وقت میری اطاعت کچھ فائدہ نہ دیگی اور سوائے ذلت و رسوائی کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

امام عالی مقام نے حالات بگڑتے دیکھے تو قیس بن سعد کو بارہ ہزار کا لشکر دے کر مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے آگے روانہ کر دیا۔ معاویہ کے جاسوس تو اسے لمحہ لمحہ کی خبریں پہنچا ہی رہے تھے۔ چنانچہ یہ اطلاع پاتے ہی معاویہ نے فوراً ایک خط قیس کو جبکہ وہ کوفے سے دور پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اس مضمون کا لکھا کہ دیکھو قیس! امام حسنؑ نے تو مجھ سے صلح کی گفتگو شروع کر رکھی ہے۔ تم کس کے لیے جان دے رہے ہو؟ دوسری طرف ایک خط امام حسنؑ کی خدمت میں روانہ کیا جس میں تحریر تھا کہ قیس تو مجھ سے صلح کر چکا ہے اور میرے آتے ہی اس نے اپنے لشکر سمیت مجھ سے مل جانے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ کن سورماؤں کے بل بوتے پر مجھ سے نبرد آزمائی کی ٹھانے ہوئے ہیں؟ چند دن بعد امامؑ جب خود کوفے سے نکل کر

نخیلہ پہنچے تو دیکھا کہ جو فوج پہلے سے وہاں بھیجی گئی تھی اس میں کا ایک سپاہی وہاں موجود نہ تھا۔ حکم کندی کو امامؑ نے چار ہزار کا رسالہ دے کر انبار بھیجا تھا۔ وہاں سے بھی اطلاع آئی کہ معاویہ نے نقد پانچ لاکھ درہم کی رشوت دیکر حاکم کو اپنی طرف ملا لیا۔ قبیلہ بنی مراد سے ایک اور شخص روانہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی رشوت اور لالچ کے اسی جال میں گرفتار ہو کر رہ گیا تھا۔

چنانچہ یہ تھے سیاسی حالات جن سے امام حسنؑ ابتدا ہی سے دوچار تھے۔ کوفہ کے کم و بیش تمام قبائل نے معاویہ کو خفیہ طور پر خطوط بھیج دیے تھے کہ وہ موقع پا کر امام کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور معاویہ کے حملہ آور ہونے پر اسے ہر ممکن مدد بہم پہنچائیں گے۔ معاویہ کا ففتھ کالم صبح و شام خوف و ہراس پھیلانے اور غلط افواہیں مشہور کرنے میں سرگرم تھا۔ خوارج اور منافقین اس ٹوہ میں تھے کہ قابو پائیں تو امامؑ کو قتل کر کے معاویہ سے جاگیریں اور نقد انعامات حاصل کریں۔ رفتہ رفتہ صورت حال اس حد تک دگرگوں ہو چکی تھی کہ نماز کے لیے امام حسنؑ مسجد میں تشریف لاتے تو لباس کے نیچے زرہ پہن کر آتے تاکہ کسی اچانک حملے سے محفوظ رہیں۔ ایک مرتبہ حالت نماز میں کسی کمین گاہ سے آپ پر تیر کا وار بھی کیا گیا لیکن امامؑ حسن اتفاق سے محفوظ رہے۔ ایک نشست میں ایک گروہ نے تم کی توہین میں شروع کر دی گئی اور اسی ہلڑ میں امامؑ کے نیچے سے ردا تک کھینچ لی گئی۔

اب قارئین خود غور فرمائیں کہ ان حالات کا تقاضا کیا تھا اور ان سے نپٹنے کے لیے امام حسن علیہ السلام کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ فیصلہ کیجیے، کیا جنگ کرنے کی صورت میں امام کو فتح کی کچھ بھی امید ہو سکتی تھی اور کیا اس جنگ میں امام کا شکست کھانا اور قتل کر دیا جانا قطعاً یقینی اور حتمی نہیں تھا؟ اور پھر غور کیجیے کہ ایسی جنگ کے بعد تاریخ فیصلہ کیا لکھتی؟ یہی نا کہ تخت خلافت کے لیے دو بادشاہ آپس میں نبرد آزما ہوئے اور امام حسنؑ اس پیکار میں مار ڈالے گئے۔ دنیا اس کے سوا اور کیا کہتی کہ یہ جنگ اقتدار کی جنگ تھی۔ دو سورما تاج و تخت کی ہوس میں ایک دوسرے سے ٹکرائے فتح معاویہ کے ہاتھ رہی اور حسنؑ اس جنگ میں کام آئے۔ غور تو کیجیے کیا یہ نتیجہ آلِ محمدؐ کی روش ان کے موقف، ان کے زاویۂ نگاہ، ان کے لائحۂ عمل اور ان کے بنیادی نظریات کے سراسر منافی نہیں تھا؟ اور کیا اس نتیجہ سے وہ بنیادی اصول پاش پاش نہ ہو جاتا جس کے استحکام اور جس کی آبیاری کی خاطر پیغمبر ختمی مرتبتؐ اور علی مرتضیٰؑ نے اپنی پوری زندگیاں صرف کر دی تھیں۔ اس کے بعد کون تھا جو سر اٹھا کے کہہ سکتا کہ آلِ محمدؐ کو حکومت سے کیا سروکار۔ ان کا مقصدِ حیات تو محض رشد و ہدایت اور ترویج دینِ حق تھا اور بس۔ وہ لوگ یقیناً امام حسن علیہ السلام پر ظلم کرتے ہیں جو آپ کی صلح کی بنیاد آپ کی سیاسی بے بسی اور بے چارگی کو قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی کی سیاسی بے بسی صلح کی وجہ قرار پا سکتی ہوتی

تو خدا کی قسم کربلا میں امام حسینؑ، امام حسنؑ سے کہیں زیادہ بے بس اور مجبور تھے۔ لیکن نہیں، صلح امام حسنؑ کی صحیح علامت ان کی بے بسی مجبوری اور بے چارگی نہ تھی بلکہ وہ نتیجہ تھا جو ایسی صورت میں جنگ کرنے سے پیدا ہوتا اور جس سے بنو امیہ اور آلِ محمدؐ دو برابر کے سیاسی حریف بن کر رہ جاتے۔

اور پھر معاویہ اگر امام حسنؑ کو شکست دے چکنے کے بعد ان کے تمام اعزا و ورثا کو بھی تہ تیغ کر دیتا تو کون تھا جو آج اسے جھٹلا سکتا؟ دنیا جانتی ہے کہ سیاسی جنگوں میں فتح پانے کے بعد فاتح اکثر راہ سے وہ تمام روڑے بھی ہمیشہ کے لئے ہٹا دیا کرتے ہیں جن سے انھیں آئندہ زندگی میں کسی قسم کا اندیشہ ہو سکتا ہو۔ ابھی کل کی بات ہے کہ عراق میں شاہ فیصل کے قتل کے بعد ان کے تمام اعزا کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور کسی کو اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکی۔ چنانچہ یقیناً معاویہ بھی جنگ میں فتح پانے کے بعد امام حسینؑ، امام زین العابدینؑ، محمد حنفیہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن جعفر اور بنو ہاشم کے دیگر تمام ورثا و افراد کو یونہی راستہ سے صاف کر دیتا۔ اور کون کہہ سکتا ہے آئندہ چل کر اسی آڑ میں حکومتِ وقت خاندانِ نبوت کا ہمیشہ یونہی دشمن بنی چلی جاتی؟ اور یہ قتلِ عام قربانِ شاہِ اقتدار کی بھینٹ ہے یا اور کچھ قرار نہ پا سکتا؟ الا بوسٹے پس منظر کا ایک بھرپور جائزہ لے کر تو ذہن خود فرمائیں کہ اس

جنگ کے تفصیلی نتائج کتنے ہولناک ہوتے جس جنگ سے باز رہنے پر بعض کوتاہ نگاہ لوگ امام حسن علیہ الصلوات والسلام کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور انھیں نعوذ باللہ من ذالک بزدل اور پست ہمت کہتے ہیں۔ حق و انصاف کے متلاشی پر تو یہ حقیقت فوراً واضح ہوجاتی ہے کہ کریم ابن امام حسنؑ نے اس موقعہ پر بجائے جنگ کے صلح کو اپنا کر قیامت تک کے لیے نہ صرف آل محمدؐ کا دامن طلب اقتدار اور حبِ جاہ کے الزام سے مبرا کر دیا بلکہ شیعیانِ اہل بیتؑ اور بنو ہاشم کی بقاء حیات کی ضمانت بھی لے لی۔

اور یہی نہیں آپ نے تاج و تخت ٹھکرا کر بنو امیہ کی جعل سازی اور فریب کاری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طشت از بام کرنے کا سامان بھی فراہم کر دیا۔ امامؑ کی دور رس اور دوربین نگاہیں کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔ آپ خوب جانتے تھے کہ آل محمدؐ اور بنو امیہ کا یہ تصادم سطحی اور سیاسی نہیں تھا بلکہ بنیادی اور اصولی تھا۔ آپ جانتے تھے کہ یہ ٹکراؤ دراصل حق و باطل اور دین و دنیا کا ٹکراؤ تھا اور بنی امیہ اسلام کی نشو و ارتقا کو ہر ممکن طریقے سے روکنے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن اس تصادم اور ٹکراؤ پر حصولِ سلطنت کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ امام نے صلح کر کے اور سلطنت و حکومت سے کنارہ کش ہو کر دفعتہً اس پردہ کو چاک کر ڈالا ۔

بر انگکن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے رامی پرستند

نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی پورے بیس برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ حقیقت دنیا پہ روشن ہوگئی کہ بنو امیہ آلِ محمدؐ کو کنجِ عزلت میں چین سے رہنے دینے پر بھی راضی نہ تھے۔ اور اس وسیع و عریض دنیا میں انھیں ان کا آرام و سکون سے جیتے رہنا بھی گوارا نہیں تھا۔ امام حسنؑ تو آج معاویہ سے تختِ خلافت کے لیے برسرپیکار تھے۔ سنہ ۶۱ھ میں امام حسینؑ نے کب یزید سے تخت و حکومت کا مطالبہ کیا تھا؟ امامؑ تو اپنے مقام پر خاموش زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی طرف سے کون سی ابتدا ہوئی تھی اور وہ کون سی اشتعال انگیزی تھی جس کے جواب میں ان سے کہا جا رہا تھا کہ یا بیعت کرو یا موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ امامؑ کا کربلا کے میدان میں یہ اعلان رہتی دنیا تک یاد رہے گا کہ عمر سعد اگر تجھے میرا اس مملکت میں رہنا بھی گوارا نہ ہو تو میں اس پر راضی ہوں کہ بچوں کو لے کر تمھاری حدود سے باہر کسی دور دراز ملک میں نکل جاؤں لیکن بنی امیہ تھے کہ امامؑ کے قتل پر ادھار کھائے بیٹھے تھے اور ان کی خون آشام تلواریں اس خونِ ناحق سے پیاس بجھانے کے لیے تڑپ رہی تھیں مطلب یہ تھا کہ ہم آلِ محمدؐ کو کسی صورت جیتا نہ چھوڑیں گے۔ وہ تخت و تاج کے دعوے دار ہوں یا نہ ہوں، وہ حکومت میں دسترس چاہیں یا نہ چاہیں اور وہ دنیا کے کسی منصب و اعزاز کی آرزو رکھیں یا نہ رکھیں، ان کو صفحۂ عالم سے مٹا دیا جائے گا۔ اب غور فرمائیے۔ امام حسنؑ نے اس جنگ سے کنارہ کشی کرکے کتنی ژرف نگاہی اور دور بینی کا ثبوت دیا تھا۔ اگر امامؑ آج جنگ میں الجھ جاتے تو قیامت تک آلِ محمدؐ کا تصادم اسی جنگ کا

سلسلہ قرار پاتا اور شاید یہ راز دنیا پہ کبھی نہ کھلتا کہ دنیا آلِ محمدؐ کی دشمن نہ تھی بلکہ آلِ محمدؐ کے مشن، ان کے اصول اور ان کے نقطۂ نظر کی دشمن تھی۔ اور بنو امیہ کا مقصد آلِ محمدؐ کے پردہ میں دراصل اسلام کی بیخ کنی کرنا اور نظریاتِ اسلام کی جڑ کاٹنا تھا اور پھر اس کے بعد اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہو جاتا ہے کہ شہادتِ عظمیٰ امام حسینؑ سے مرتب ہونے والے وہ تمام نتائج دراصل صلح امام حسنؑ ہی کے مرہونِ منت تھے۔

امام حسنؑ تختِ خلافت پر بیٹھ چکے تھے۔ اگر وہ جنگ کرتے تو یہ جنگ لامحالہ اقتدار ہی کی جنگ قرار پاتی۔ اس کے برخلاف امام حسینؑ نے اس مسند کو ابھی نہیں چھوا تھا۔ اس لیے ان کی جنگ خالص اصولی جنگ تھی اور طلبِ حکومت کا الزام آپ پر عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی نہیں، اگر امام حسنؑ جنگ میں الجھ جاتے تو آپ سے لیکر حضرت حجتؑ تک پورے سلسلہ کا باطل سے تصادم اسی اقتدار کی جنگ کی کڑیاں تصور ہوتا۔ امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کر کے اس سلسلہ کو وہیں کاٹ دیا۔ اور اس طرح نہ صرف امام حسینؑ کی جنگ کو اصولی جنگ کہلوانے کا موقع بخشا بلکہ آئندہ آنے والے سلسلۂ معصومین کے بنی امیہ اور بنی عباس سے ہونے والے ٹکراؤ کو بھی اسی اصولی اور روحانی جنگ کی زنجیر میں پرو دیا۔

اس پوری تصویر کو سامنے رکھ کر اور تعصب و عناد کی عینک اتار کر

نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی پورے بیس برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ بہ حقیقت دنیا پہ روشن ہوگئی کہ بنو امیہ آلِ محمدؐ کو کنجِ عزلت میں چین سے رہنے دینے پر بھی راضی نہ تھے۔ اور اس وسیع و عریض دنیا میں انھیں ان کا آرام و سکون سے جیتے رہنا بھی گوارا نہیں تھا۔ امام حسنؑ تو آج معاویہ سے تختِ خلافت کے لیے برسرِپیکار تھے۔ سنہ ۶۱ھ میں امام حسینؑ نے کب یزید سے تخت و حکومت کا مطالبہ کیا تھا؟ امامؑ تو اپنے مقام پہ خاموش زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی طرف سے کون سی ابتدا ہوئی تھی اور وہ کون سی اشتعال انگیزی تھی جس کے جواب میں ان سے کہا جا رہا تھا کہ یا بیعت کرو یا موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ امام کا کربلا کے میدان میں یہ اعلان رہتی دنیا تک یاد رہیگا کہ عمر سعد اگر تجھے میرا اس مملکت میں رہنا بھی گوارا نہ ہو تو میں اس پر راضی ہوں کہ بچوں کو لے کر تمھاری حدود سے باہر کسی دور دراز ملک میں نکل جاؤں لیکن بنی امیہ تھے کہ امامؑ کے قتل پر ادھار کھا چکے تھے اور انکی خون آشام تلواریں اس خونِ ناحق سے پیاس بجھانے کے لیے تڑپ رہی تھیں مطلب یہ تھا کہ ہم آلِ محمدؐ کو کسی صورت جیتا نہ چھوڑیں گے۔ وہ تخت و تاج کے دعوے دار ہوں یا نہ ہوں، وہ حکومت میں دسترس چاہیں یا نہ چاہیں اور وہ دنیا کے کسی منصب و اعزاز کی آرزو رکھیں یا نہ رکھیں، ان کو صفحۂ عالم سے مٹا دیا جائے گا۔ اب غور فرمایئے۔ امام حسنؑ نے اس جنگ سے کنارہ کشی کر کے کتنی ژرف نگاہی اور دوربینی کا ثبوت دیا تھا۔ اگر امامؑ آج جنگ میں الجھ جاتے تو قیامت تک آلِ محمدؐ کا تصادم اسی جنگ کا

سلسلہ قرار پاتا اور شاید یہ راز دنیا پہ کبھی نہ کھلتا کہ دنیا آلِ محمدؐ کی دشمن نہ تھی بلکہ آلِ محمدؐ کے مشن، ان کے اصول اور ان کے نقطۂ نظر کی دشمن تھی۔ اور بنو امیہ کا مقصد آلِ محمدؐ کے پردہ میں دراصل اسلام کی بیخ کنی کرنا اور نظریاتِ اسلام کی جڑ کاٹنا تھا اور پھر اس کے بعد اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہو جاتا ہے کہ شہادتِ عظمیٰ امام حسینؑ سے مرتب ہونے والے وہ تمام نتائج دراصل صلح امام حسنؑ ہی کے مرہونِ منت تھے۔

امام حسنؑ تختِ خلافت پر بیٹھ چکے تھے۔ اگر وہ جنگ کرتے تو یہ جنگ لامحالہ اقتدار ہی کی جنگ قرار پاتی۔ اس کے برخلاف امام حسینؑ نے اس مسند کو ابھی نہیں چھوا تھا۔ اس لیے ان کی جنگ خالص اصولی جنگ تھی اور طلبِ حکومت کا الزام آپ پہ عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی نہیں، اگر امام حسنؑ جنگ میں الجھ جاتے تو آپ سے لے کر حضرت حجتؑ تک پورے سلسلہ کا باطل سے تصادم اسی اقتدار کی جنگ کی کڑیاں تصور ہوتا۔ امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کر کے اس سلسلہ کو وہیں کاٹ دیا۔ اور اس طرح نہ صرف امام حسینؑ کی جنگ کو اصولی جنگ کہلوانے کا موقع بخشا بلکہ آئندہ آنے والے سلسلۂ معصومین کے بنی امیہ اور بنی عباس سے ہونے والے ٹکراؤ کو بھی اسی اصولی اور روحانی جنگ کی زنجیر میں پرو دیا۔

اس پوری تصویر کو سامنے رکھ کر اور تعصب و عناد کی عینک اتار کر

آپ حالات کا دیانت سے جائزہ لیں تو کیا یہ سوال خود بخود حل نہیں ہو جاتا کہ کیوں امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے اور سید الشہداء امام حسینؑ نے طاغوتی طاقتوں سے جنگ کی اور کیوں ان دو عہدوں کے درمیان امام حسن علیہ السلام نے صلح کو اپنایا؟ اور پھر کیا یہ تینوں عہد فی الحقیقت ایک ہی سلسلہ کی بالکل ایک دوسرے سے ملی ہوئی کڑیاں نظر نہیں آتیں اور کیا اس صلح و جنگ کے پردہ کے نیچے ایک ہی لائحہ عمل اور ایک ہی مکتبِ خیال کا یکساں بہاؤ صاف دکھائی نہیں دیتا؟ امیر المومنینؑ نے جنگ کی، اس لیے کہ انھیں دشمن کے مقابلہ میں فتح کا یقین تھا امام حسینؑ نے جنگ کی، اس لیے کہ یہاں تخت و تاج کا کوئی دعویٰ اور سلطنت و حکومت کا کوئی الجھاؤ ہی نہیں تھا۔ رہے امام حسنؑ تو ان کے حالات ان دونوں بزرگوں کے حالات سے قطعاً مختلف اور متضاد تھے۔ نہ انھیں حضرت علیؑ کی طرح غلبہ حاصل تھا اور نہ انھیں امام حسینؑ کی طرح دعویٰ سلطنت سے سبکدوشی اور لاتعلقی حاصل تھی۔ اب بتلائیے اس قول میں کون سی خامی ہے کہ حسنؑ علی بھی تھے اور حسینؑ بھی۔ یعنی امام حسنؑ کی جگہ اگر حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ ہوتے تو صلح کرتے اور حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کی جگہ اگر امام حسنؑ ہوتے تو جنگ کرتے۔ اور پھر اندازہ کیجیے کہ بصیرت و دوربینی کے اس تاجدار نے آیندہ آنے والے حالات کو کتنی نگاہوں سے بھانپ کر اور قضا و قدر کے کون سے دریچوں

ہیں سے جھانک کر پچاس برس پہلے فرمایا تھا کہ میرے یہ دونوں فرزند امام ہیں خواہ وہ صلح کر کے بیٹھ جائیں اور خواہ وہ جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

رہا یہ سوال کہ کیا امام حسنؑ خاکم بدہن فی الواقعہ فطرتاً بزدل اور پست ہمت تھے تو اس شیر بیشۂ رسالت کی شجاعت و پامردی کی داستانوں سے کون سی تاریخ ہے جس کے صفحات جگمگا نہیں رہے ہیں اور وہ کونسا غزوہ ہے جس میں آپ نے کارہائے نمایاں انجام نہ دیے ہوں۔ اور جس میں آپ نے دادِ شجاعت نہ دی ہو۔ صفین کی ہولناک جنگ میں جب گھمسان کا رن پڑ رہا تھا ایک مرتبہ امیر المومنینؑ کو بار بار محمد حنفیہ کو حملہ کرنے کے لیے بھیجنا پڑا۔ محمد حنفیہ تھوڑی دیر تیغ زنی کرتے اور پھر پسینہ میں تر اور واپس لوٹ آتے۔ امیر المومنینؑ نے اچانک امام حسن علیہ السلام کی طرف جو قریب ہی کھڑے تھے اشارہ کیا۔ امام فوراً شمشیر بکف ہوا کو کاوہ کرتے ہوئے اس مور و ملخ سے لشکر میں گھس گئے، اور دیکھتے ہی دیکھتے فوجوں کی گہرائیوں میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب آپ اس خون کے دریا میں سے ابھرے تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ امام اب لشکر کے اس پار نہ تھے بلکہ اُس پار تھے۔ پھر بغیر سستائے آپ نے رُخ پلٹا۔ ایک نگاہ غلط انداز لشکر کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر پہ ڈالی اور پھر اس میں در آئے

ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ صفوں کی صفیں کٹتے ہوئے اور دشمن کی فوجوں کو چیرتے ہوئے آپ پھر واپس آکر امیرالمومنین ؑ کی خدمت میں حاضر تھے۔

اور غور تو کیجیے ایک ایسے شجاع اور جنگ جو انسان کے لیے صلح کرنا اور صلح کے وہ دس برس گزارنا جو کہ بعد میں امام حسن ؑ کو گزارنے پڑے کتنا سخت اور کٹھن امتحان تھا۔ لوگ عام طور پر جنگ کی نسبت صلح کو سبک اور آسان سمجھتے ہیں حالانکہ صلح کی منزل امام حسن ؑ کے لیے کہیں زیادہ مشکل اور دشوار گزار تھی۔ امام حسین علیہ السلام کا امتحان یقیناً مشکل اور سخت مشکل تھا لیکن یہ ساری مشکل تین پہر کی مشکل تھی۔ صبح جنگ شروع ہوئی اور عصر تک کھیل تمام تھا۔ دوسری طرف امام حسن ؑ کی آزمائش پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ اس نام نہاد صلح کے دامن سے کیسے کیسے مصائب، آلام وابستہ تھے۔ پورے دس برس تک امام ؑ اور امام کے ساتھی ہدفِ طعن و تشنیع رہے۔ آپ کے دوست، مددگار اور شیعہ چن چن کر عقوبت میں گرفتار کیے جاتے۔ آلِ محمد ؐ کا دم بھرنے والوں پر عرصۂ حیات روز بروز تنگ ہوتا جاتا۔ ان کا جان و مال اور عزت و آبرو کچھ بھی محفوظ نہ تھا۔ امام ؑ کو وقتاً فوقتاً دربار جبروت میں حاضر ہونا پڑتا، جہاں آپ کو ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا جاتا۔ جس مجلس میں امام حاضر ہوتے وہاں منبر

امامت اور بالخصوص عہد علوی پر رکیک حملے کیے جاتے اور مسجدوں اور منبروں سے آپ کے والد بزرگوار پر ہر خطبہ میں سب ہوتی۔ لیکن امامؑ تھے کہ کوہِ صبر وشکر واستقامت بنے ہوئے یہ سب کچھ برداشت کرتے۔ یہ تھی صلح کی وہ خارزار اور صبر آزما وادی جس میں امام حسنؑ کو پورے دس برس چلنا پڑا۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

واقعہ یہ ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مواقع آجاتے ہیں جہاں جذبات اسے دشمن سے ٹکرا کر جان پر کھیل جانے کے لیے ابھارتے ہیں لیکن احساسِ فرض کی زنجیر اسے خاموش رہنے اور دست و پا توڑ کر بیٹھ جانے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی مواقع ہوتے ہیں جو اس انسان کے معراجِ کمال اور اس کے جوہرِ انسانیت کی ارتقا کی منازل کو پرکھتے اور انھیں پرکھ کر اس کی قدر و قیمت کے درجات متعین کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک موقع پیغمبرِ اسلامؐ کی حیات طیبہ میں اس وقت آیا تھا جب آپ مدتوں پہلے چھوٹے ہوئے وطن کی محبت سے مجبور ہو کر ۶ھ میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لائے تھے اور جب کفار نے آپ کو مکہ معظمہ کی نواحی میں آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ پیغمبرؐ چاہتے تو

اپنے ہزاروں جاں نثاروں کی تلواروں کے سائے میں کفار سے لڑ کر دلِ مضطر کی پیاس بجھانے کا سامان کر لیتے لیکن نہیں۔ بقائے دین اور احساس فرض کے تقاضے کچھ اور تھے، دنیا نے دیکھا کہ آپ نے مراجعت کو پیش قدمی پر ترجیح اس عہدنامہ پہ دستخط فرماتے ہوئے دی، جسے تاریخ صلح نامۂ حدیبیہ کے نام سے یاد کرتی ہے، اور جس صلح نامہ کی شرائط کو آج تک بعض کوتاہ بین غیر منصفانہ ہی نہیں بلکہ ہتک آمیز کہنے سے نہیں چوکتے۔

ایسا ہی ایک موقع امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی زندگی میں اس وقت آیا تھا جب آپ مفارقتِ رسولِ اکرمؐ کا زخم کھائے ہوئے ان کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے کہ اچانک خبر آئی کہ اصحاب کے ایک گروہ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں حکومت و خلافت اپنے لیے طے کر لی۔ آپ کے غم و غصہ کا کیا عالم تھا اور اس غم و غصہ اور جوشِ جذبات کے باوجود آپ کی اس فیصلہ پہ خاموشی ضمیر کی کون سی مجبوریوں کی آئینہ دار تھی یہ نہج البلاغہ کے خطبہ شقشقیہ میں دیکھنے کے قابل ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں کہ میں سوچ رہا تھا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کر دوں یا اس بھیانک تیرگی پہ صبر کروں۔ میری آنکھوں میں غبار اندوہ

کے تنکے کھٹک رہے تھے اور میرے حلق میں رنج و غم کی پھانس اٹکی ہوئی تھی۔ میں اپنی میراث کو لٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا، لیکن آخر کار میں نے اس اندھیرے میں صبر ہی کرنا مناسب سمجھا۔

مفادِ اسلام، احساسِ فرض اور جبر و نفس کشی کی یہی وہ منزل تھی جو امام حسنؑ کو ان صبر آزما اور روح فرسا حالات میں کہ جن کا تذکرہ اوپر ہوا خاموش رہنے پر مجبور کر رہی تھی، ورنہ جان دے دینا اور قربان گاہ شہادت میں سر کی بازی لگا دینا تو خاندانِ بنی ہاشم کے ادنیٰ سے ادنیٰ افراد کے لیے بھی ایک کھیل سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اور امام حسنؑ علیہ السلام تو خانوادۂ رسالتؐ کے ایک منفرد چشم و چراغ ہی نہ تھے بلکہ آغوشِ تربیتِ رسولؐ کے ایک ایسے گوہر آبدار تھے جس پر رسالت کو خود ناز تھا۔ شہامت و شجاعت آپ کے گھر کی کنیز تھی اور جہاد و جانبازی کا سبق عرب و عجم اور عراق و روم کے دلیروں نے اسی گھر سے سیکھا تھا۔

بہرنوع سیاسی، اصولی اور دینی حالات کی یہ تصویر آپ کے سامنے ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ کیا ان حالات میں امام حسنؑ کے لیے ایک اور صرف ایک

ہی راستہ نہ تھا کہ معاویہ کو صلح کی پیشکش کرتے اور کہتے کہ تم جو بھی شرائط لاؤ میں منظور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جنگ کی صورت میں جیسا کہ اوپر دکھایا گیا آپ کا ہلاک ہو جانا یقینی تھا۔ اور آپ کے ہلاک ہو جانے میں آلِ محمدؐ کے پورے لائحہ عمل کی شکست تھی۔ خانوادۂ رسالت کے موقف اور ان کے نظریات پر ایک ضرب کاری لگ رہی تھی۔ رسالت و امامت کا دامن حبِ جاہ اور طلبِ اقتدار کی ناپاک تہمت سے ملوث ہو رہا تھا، اور یہ دکھانے کا موقع کہ ہم تخت و سلطنت نہ بھی چاہیں تو بھی دشمنانِ اسلام ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے چھن رہا تھا، پھر کیا ہر لحاظ سے یہ مناسب نہ تھا کہ امام حسنؑ معاویہ کے سامنے صلح کے لیے ہاتھ پھیلاتے اور وہ جو بھی شرائط پیش کرتا آپ انھیں قبول فرماتے۔ لیکن کیا کہنا قدرت کی کرشمہ سازی کا! تاریخ کا دھارا کچھ اس طرح سے پلٹا کہ امام عالی مقام کی حقانیت قیامت تک کے لیے واضح ہو گئی۔ آج امام حسنؑ کا بدترین مخالف بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ صلح کی پیشکش پہلے معاویہ کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ امام حسنؑ کی طرف سے ہوئی۔ ایک خط معاویہ کی

طرف سے امام حسنؑ کو ربیع الاوّل ۴۱ھ میں ملا۔ لکھا تھا
یا حسنؑ! میں صلح چاہتا ہوں، کشت و خون سے آپ کے
ہاتھ کچھ نہ آ سکے گا۔ آئیے میں صلح کا طالب ہوں۔ مجھ
سے تعاون کیجیے۔ ساتھ ہی ساتھ معاویہ نے وہ تمام خطوط
بھی امامؑ کی خدمت میں ارسال کر دیے جو کوفہ و عراق
کے لوگوں نے خفیہ طور پر اسے بھیجے تھے۔ اور جن میں امامؑ
کے خلاف معاویہ کو مدد دینے کے وعدے کیے گئے
تھے۔ اور یہی نہیں، جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ معاویہ
نے امام کو یہ بھی بالصراحت لکھ دیا کہ یا حسنؑ صلح کے
لیے شرائط میری نہیں بلکہ آپ کی ہوں گی۔ آپ جو
بھی شرائط پیش فرمائیں گے میں منظور کروں گا۔ اب
قارئین خود فیصلہ کریں کہ امامؑ کو ان حالات میں کیا کرنا
چاہیے تھا۔ ایک طرف حالات کی پکار یہ ہے کہ
معاویہ سے صلح کر لی جائے۔ خواہ اس کے لیے پیشکش
اپنی ہی طرف سے کیوں نہ کرنی پڑے۔ اور خواہ وہ کیسی
ہی ذلت آمیز شرائط لائے۔ اور دوسری طرف دشمن
خود آگے بڑھ کر نہ صرف صلح مانگ رہا ہے بلکہ
شرائط کے لیے بھی کورا کاغذ پیش کر رہا ہے۔ اب
کیسے ماتم نہ کیا جائے ان لوگوں کے فہم و ادراک

کا اور ان کے جذبۂ دیانت و حق گوئی کا جو یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی امامؑ کی صلح پر نکتہ چینی کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ ورنہ ایک سنجیدہ اور انصاف پسند ذہن تو فوراً بول اٹھتا ہے کہ ان حالات میں اگر امامؑ بجائے صلح کے جنگ کرنے پر اصرار کرتے تو وہ تاریخ کی عدالت میں ہمیشہ کے لیے ملزم اور موردِ تنقید و نکتہ چینی ٹھہرتے۔

یہاں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ معاویہ ایک صلح جُو اور آشتی پسند انسان تھا اور اسی لیے اس نے وہ تمام شرائط قبول کر لینا منظور کر لیا تھا کہ جو امام حسنؑ پیش کرنا چاہیں۔ معاویہ کا مقصد اس وقت مطلب برآری تھا اور بس! ورنہ معاویہ کے کردار سے کون واقف نہیں تاریخ گواہ ہے کہ کارزارِ حیات میں امیرِ شام کے کامیاب ترین ہتھیار حیلہ جوئی اور ابن الوقتی تھے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ابھی اس صلحنامہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہونے پائی تھی کہ معاویہ مسجدِ کوفہ میں پکار رہا تھا کہ یہ صلح نامہ میرے پاؤں کی ٹھوکر پر ہے میں جیسے چاہوں گا کروں گا۔ خبردار جو بھی میرے راستہ میں حائل ہوگا اور بغاوت پر آمادہ نظر آئے گا، کچل

دیا جائے گا۔

لیکن اللہ رے امام عالی مقامؑ کی بصیرت اور اُن کا حُسنِ احتیاط۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی آپ نے اتمامِ حجّت ضروری سمجھا۔ تاکہ آیندہ کے مؤرخ کے لیے کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہونے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ علامہ مجلسیؒ کی روایت ہے کہ امامؑ نے اپنے تمام تابعین کو جمع فرمایا اور ایک بلیغ خطبہ دیا جس میں حمدِ خدا و رسولؐ کے بعد آپ نے صورتِ حال پر مفصل روشنی ڈالی اور پھر ان سے مدد کا مطالبہ کیا۔ راوی کہتا ہے، لوگ اُٹھ اُٹھ کر مسجد سے جانے لگے، اور آخرکار لبیک کہنے والوں کی تعداد گرتے گرتے صرف ۳۹ پر آ پہنچی۔ عجب نہیں امامؑ نے وہیں سے اپنے جدؐ کو مخاطب کیا ہو اور فرمایا ہو، کہ نانا! دیکھیے آپ کے اس لاڈلے نواسے پر مصیبتوں کے کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ نانا! آپ تو مخلصین کی تعداد انتالیس تک پہنچ جانے پر بھی خاموش رہے تھے اور آپ نے اعلانِ جہاد کرنا اس وقت تک مناسب نہ سمجھا تھا، جب تک کہ ان کی

تعداد پوری چالیس نہ ہو گئی تھی، فرمائیے میرے لیے کیا حکم ہے؟

ختم شُد

(نامی پریس لاہور)

maablib.org